ابوطالب کے ایمان وکفر کی تحقیق

سوال نمبر ۱ آنحضرت ﷺ کا خطبہ نکاح ابوطالب نے پڑھا، اس سے الفاظ کفر، کہاں ہیں؟

جواب نمبر ۱ سیرت ابن وہشام عربی میں وہ خطبہ موجود نہیں البتہ روض الانف سہیلی، جلد نمبر ۱، صفحہ نمبر ۱۲۲ میں بحوالہ سیرت المصطفیٰ ﷺ، جلد نمبر ۱، صفحہ نمبر ۹۴ سے خطبہ نکاح کے اتنے الفاظ ملے ہیں

اما بعد فان محمدا ممن لا یوازن به فتی من قریش الا رجح به شرفا ونبلا وفضلا وعقلا وان کان فی المال قل فانه ظل زائل وعاریه مسترجعه وله فی خدیجه بنت خویلد رغبه ولها فیه مثل ذالک

محمد ﷺ وہ ہیں کہ قریش میں سے جو جوان بھی شرف اور رفعت اور فضیلت اور عقل میں آپ کے ساتھ تولا جائے تو آپ ہی بھاری رہیں گے۔ مال میں اگرچہ آپ کم ہیں لیکن مال ایک زائل ہونے والا سایہ ہے اور واپس کی جانے والی مانگی ہوئی چیز ہے یہ خدیجہ بنت خویلد کو چاہتے ہیں اور وہ ان کو چاہتی ہے۔

اس خطبہ میں نہ **لآ اله الا الله** کا اقرار ہے نہ حضرت محمد ﷺ بن عبد اللہ کو رسول و نبی کہا گیا ہے جو مدار ایمان ہے تو محض خطبہ پڑھنے سے حضرت ابو طالب کو مومن نہ کہا جائے گا ہاں اس وقت کفر کی بھی صراحت نہیں ہے کیوں کہ آپ نے توحید ورسالت کی ابھی دعوت بھی نہیں دی تھی تو وہ کس چیز کا انکار کر کے کافر کہلاتے جیسے پندرہ سال بعد بعثت کے وقت کلمہ توحید ورسالت کا انکار کرنے کی وجہ سے بشمول ابو طالب کئی قریش کافر بنتے گئے۔ اس توجیہہ سے حضور ﷺ کے والدین سے بھی ہم کفر کی نفی کرتے ہیں۔

سوال نمبر ۲ صحرا میں ابوطالب کو آنحضرت ﷺ نے پانی پلایا اور آنحضرت ﷺ سے بیماری میں ابو طالب نے دعا کرائی، صحت پائی (ابن سعد اسابہ خصائص کبریٰ، جلد نمبر ۱، صفحہ نمبر ۱۸۵) کیا یہ مقام حق الیقین نہیں ہے؟

جواب نمبر ۲ سب قریش حضور ﷺ کو امین، صادق، نیک، بزرگ اور مستجاب الدعوات خدا کا بندہ جانتے تھے۔

اگر ابو طالب نے کلمہ پڑھے بغیر آپ ﷺ سے دعا کرائی اور چشمہ پھوٹنے کا معجزہ دیکھا تو اپنی قوم سے انوکھا کام نہیں کیا۔ اس سے حق الیقین تو کیا، نفس ایمان بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اگر دولت ایمان حاصل ہوتی تو طالب کے باوجود اپنی بیٹی اُم ہانی کا رشتہ حضور ﷺ سے کرتے، ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی سخت کافر سے نہ کرتے (اصابہ وابن سعد) نیز گھر کا ماحول مومنانہ ہوتا۔ ورنہ کیا وجہ کہ آپ کے بیٹے حضرت جعفرؓ اور حضرت علیؓ جو آپ کی ناداری کی وجہ سے حضرت عباسؓ اور آنحضرت ﷺ کی پرورش میں تھے، دولت ایمان سے مشرف ہوئے اور اپنے زیر کفالت طالب اور عقیل (حضرت عقیلؓ) کافر رہے۔ طالب بدر میں مقتول ہوا اور حضرت عقیلؓ قید ہوئے جو کہ بعد میں فتح مکہ پر مسلمان ہوئے۔

سوال نمبر ۳ ابو طالب نے شعب ابی طالب کی قید سے خلاصی یا کر یہ دعا کی تھی **اللھم انصرنا علی من ظلمنا و قطع رحمنا واستحل ما یحرم علینا**۔ کیا منکر خدا ایسی دعا مانگتا ہے؟

جواب نمبر ۳ جب آغاز اسلام میں مکہ والوں پر تکذیب کی وجہ سے قحط سالی کا عذاب آیا جس کا ذکر پارہ نمبر ۱۴ رکوع نمبر ۱۶ میں ہے، تو سب کفار آپ سے دعائیں کرانے آتے تھے اسی طرح فتح مکہ سے پہلے حضرت ابوسفیانؓ معاہدہ تحریر کرانے آئے تھے تو قحط زدہ قوم کے لیے دعا کرانے کی آنحضرت ﷺ سے درخواست کی تھی۔ سب کفار قریش خدا کو مانتے اور اس سے دعائیں کرتے تھے تو مشرک و کافر منکر خدا نہیں ہوتا ہاں، اللہ کا شریک بنات اور شریعت و رسالت کا انکار کرتا ہے۔

سوال نمبر ۴ کوئی ایسی روایت بتائیں جس میں ابو طالب کی بت پرستی کا ذکر ہو؟

جواب نمبر ۴ شیعہ کی معتبر کتاب سے حوالہ پیش خدمت ہے

"حضرت جعفر صادقؒ سے منقول ہے کہ ابو طالب کی مثال اصحاب کہف کی سی ہے، جو ایمان کو اپنے دل میں

چھپائے ہوئے تھے اور عملاً شرک کا اظہار کیا کرتے تھے جس کے عوض خدا نے ان کو دوہرا اجر عطا فرمایا تھا"۔

(ترجمہ مقبول شیعہ، صفحہ نمبر ۳۶۹، پارہ نمبر ۲۰، زیر آیت **انک لا تھدی**)

حضرت جعفر صادق کی اس نئی خبر سے پتہ چلا کہ آں جناب عملاً شرک کا ارتکاب کرتے تھے اور یہی قریش کا مروجہ بت پرستی والا مذہب تھا۔ بت پرستی کے سوا شرک عملی کی اور کوئی صورت ہو تو شیعہ ہی بتائیں؟ اس میں اصحاب کہف کی مثال بالکل بے ربط اور غلط ہے کیوں کہ وہ ظاہرا اور باطنا موحد تھے۔ اللہ فرماتا ہے

"بے شک وہ ایسے جوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا تھا جب کہ وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا پروردگار تو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے ہم ہرگز اس کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ (اگر ایسا کریں) تو اس صورت میں گویا ہم نے بہت ہی نامناسب بات کہی۔ ہماری قوم نے تو اس کے سوا بہت سے خدا بنا لیے ہیں۔ پھر ان خداؤں کے متعلق کوئی دلیل کیوں نہیں پیش کرتے پس اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے اور اب جب تم ان سے الگ ہو چکے ہو اور جن چیزوں کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں۔ ان کو چھوڑ چکے ہو تو کسی غار میں چل رہو۔۔۔ الخ"۔

(ترجمہ مقبول شیعہ، صفحہ نمبر ۳۵۲، پارہ نمبر ۱۵، سورۃ کہف، رکوع نمبر ۲)

یہ ایک کھلی تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت ابوطالب نے نہ کلمہ توحید و رسالت پڑھا، نہ اتباع پیغمبر ﷺ میں اپنی قوم کو بت پرستی کی تردید کی نہ ان سے علیحدہ ہوئے، نہ کافروں نے ان کو اپنے مذہب کا مخالف اور مسلمان سمجھ کر تکلیف و ایذا پہنچائی جیسے انہوں نے آپ کے صاحبزادے حضرت جعفر طیار ؓ کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا تو وہ اصحاب کہف جیسے کیسے ہوئے؟ یہ ایک بے بنیاد دعویٰ ہے جو شیعوں کے امام کو ہی زیب دیتا ہے۔

سوال نمبر ۵ ایسی روایت بتائیں جو یہ ثابت کرے کہ فلاں وقت ابوطالب نے عقیدہ توحید کی مخالفت کی؟

جواب نمبر ۵ موافقت بھی نہیں کی تھی تو آپ کا نام عبد مناف بت کے نام پر تھا اور بیٹے جعفر نے ہجرت کی۔ سگی

وشیعہ کی متفقہ قدیم ترین کتاب "سیرت ابن ہشام" میں ہے کہ

"اہل علم کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ نماز کے وقت مکہ کی گھاٹیوں میں چلے جاتے۔ حضرت علی جب دس سال کے لڑکے تھے، اپنے باپ سب چچوں اور باقی قوم سے چھپ کر آپ ﷺ کے ساتھ ہو جاتے اور نمازیں پڑھتے، شام کو واپس آتے۔ ایک عرصہ تک جتنا اللہ نے چاہا ایسا کرتے رہے ایک دن ابو طالب کو ان کے نماز پڑھنے کا پتہ چل گیا تو رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ یہ کونسا دین ہے جس کا پابند میں تم کو دیکھ رہا ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے چچا! یہی اللہ کا، اللہ کے فرشتوں کا، اللہ کے پیغمبروں کا اور ہمارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے اور تم قال ﷺ مجھے اللہ نے یہی دین دے کر بندوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اے چچا! جن لوگوں کی خیر خواہی کرکے میں ان کو ہدایت کی طرف بلاؤں اور وہ میری بات مانیں اور میری امداد کریں ان سب سے زیادہ اس دین کو ماننے کے آپ حق دار ہیں، تو ابو طالب نے کہا

ای ابن اخی انی لا استطیع ان افارق دین آبائی وماکانو علیہ

اے بھتیجے! میں اپنے باپ دادا کا دین اور جس چیز (بت پرستی) پر وہ تھے اسے نہیں چھوڑ سکتا لیکن میری موجودگی میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچ پائے گی"۔ (ج ا ص ۲۹۳، "اسلام علی منہاد سیرت ۱۳۵۵ھ")

اگر ابو طالب مخالف توحید نہ ہوتے تو حضرت علیؓ کو آپ سے چھپنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر آپ نے صاف طور پر اس توحید و رسالت اور ایمان کو اپنے بیٹے حضرت علیؓ کی طرح قبول کیوں نہ کر لیا اور اپنے باپ دادا کے مذہب پر کاربند رہنے کا اصرار کیوں کیا؟ صرف سربراہ خاندان کی حیثیت سے اتنی حمایت ظاہر کی کہ میری زندگی میں آپ کو تکلیف نہ پہنچے گی۔ ایسی حمایت کتنے شریف غیر مسلم آج بھی اپنے مسلم رشتہ داروں کی کرتے رہتے ہیں، جو ان کے ایمان و اسلام کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

سوال ۲ ایسا واقعہ بتائیں کہ ابو طالب نے غیر اللہ معبودوں کی حمایت و تعریف کی ہو؟

جواب نمبر ۶   آباء واجداد کی مذکورہ بالا تشریح جواب کافی ہے کیوں کہ بت پرست آباء واجداد کے مذہب پر اصرار، رسول خدا ﷺ کی توحید وہدایت کے بالمقابل، غیر اللہ کی حمایت وتعریف ہی ہے۔

سوال نمبر ۷   کیا شعب ابی طالب میں ابوطالب نے غیر خداؤں کی عبادت کی؟

جواب نمبر ۷   اس کے متعلق کتب سیرت میں صراحت ہے

"ابوطالب نے مجبور ہو کر مع خاندان کے شعب ابی طالب میں پناہ لی۔ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب مومن اور کافر سب نے آپ کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں نے دین کی وجہ سے اور کافروں نے خاندانی اور نسبی تعلق کی وجہ سے بنو ہاشم میں سے صرف ابولہب قریش کا شریک رہا"۔ (سیرت المصطفیٰ ﷺ ج ا ص ۲۹۰، ابن سعد ج ا ص ۱۳۹ اور ابن ہشام ج ا ص ۱۲۲ طبع قدیم)

پتہ چلا کہ خاندانی لحاظ سے یہ شرکت شعب مؤید ایمان نہیں ہے۔ پھر غیر اللہ کی عبادت کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ بت بروقت پاس یا سامنے ہوں ان سے نا بانہ استعانت بھی شرک ہے۔ یہ کافر لوگ شعب ابی طالب میں بھی یقیناً اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوں گے اور حضور ﷺ کے پیچھے ان کے نمازیں پڑھنے کا تو کوئی ثبوت نہیں تو فیصلہ اصل بنیاد پر ہوگا کہ کافر اپنے مذہب پر رہے۔ خواہ بت پرستی کا موقع نہ ملے اور مسلمان اپنے مذہب پر رہے۔

سوال نمبر ۸   حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام غیر اللہ کا ذبیحہ نہ کھاتے تھے، ابوطالب کے دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ابوطالب مشرک نہ تھے!

جواب نمبر ۸   ابوطالب کے دسترخوان پر ہمیشہ کھانا مسلّم نہیں۔ تاریخ میں ہے کہ جناب عبد المطلب نے آپ ﷺ کو اپنے بڑے مالدار صاحب زادے زبیر کے سپرد کیا ان کے ہاں آپ ﷺ کی پرورش ہوئی جو

معاہدہ حلف الفضول (جب حضور ﷺ کی عمر ۲۳ برس تھی) میں شریک تھے۔ پھر آپ ﷺ مستقل صاحب روزگار اور تاجر بن گئے اور اپنا کھاتے تھے۔ علاوہ ازیں غیر اللہ کا ذبیحہ ان کے کھانوں اور مخصوص میلوں، عرسوں پر بٹتا تھا۔ حضور ﷺ نے واقعی ایسا گوشت اور تبرک کبھی نہ کھایا، گھر کا تیار شدہ کھانا ایسا نہ ہوتا تھا یا وہ بازار سے خریدا جاتا یا گھر میں بنام خدا ذبح کر کے تیار کیا جاتا تھا اور یہ تو معلوم ہے کہ اس وقت بھی مشرک ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیتے تھے اور تکبیر پڑھ کر ذبح کرتے تو اس کا کھانا حلال تھا۔ مشرک کے ذبیحہ کی حرمت **بسم اللہ اللہ اکبر** پڑھنے کے باوجود وہ خالص اسلامی مسئلہ ہے جو بعد میں اسلام نے پیش کیا۔ اس کا اطلاق عہد جاہلیت کے سام ذبیحوں پر نہیں کیا جائے گا۔ جیسے شریعت ابراہیمی کے مطابق نکاح جائز تھے گھروں میں ذبیحے بھی درست تھے۔

نوٹ: ہم نے بادل نخواستہ ان سوالات کے جوابات میں حضرت ابوطالب متعلق شیعہ غلو کی نفی کی ورنہ ہمیں آپ کی ذات سے بغض و کدورت نہیں بلکہ ہم دعویٰ نبوت کے بعد ایمان کی کفار کے مقابل حضور ﷺ کی حمایت اور طرف داری کا پورا احترام کرتے ہیں اور لحاظ حضرت۔ جناب وغیرہ کے ساتھ ان کا بااب ذکر کرتے ہیں مگر ان کا اسلام قبول نہ کرنا ایک تاریخی حقیقت ہے اور اہل السنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی سیرت المصطفیٰ ﷺ ج ا ص ۲۰۷ حاشیہ پر فرماتے ہیں "اہل سنت میں ان کے کفر کے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ روافض ابوطالب کے ایمان کے قائل ہیں"۔ اہل سنت کے متفقہ دلائل یہ ہیں

ا۔ مسند احمد، بخاری، مسلم اور نسائی میں ہے کہ جب آپ ﷺ نے ابوطالب کے سامنے مرتے وقت کلمہ پیش کیا کہ ایک مرتبہ پڑھ لو تا کہ تمہاری سفارش کر سکوں۔ اس وقت ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ نے کہا "کیا تم عبدالمطلب کی ملت کو چھوڑتے ہو؟" تو ابوطالب نے **لا الہ الا اللہ** کہنے سے انکار کر دیا اور آخری کلمہ **علی ملۃ عبدالمطلب** کہا۔ بعض روایات میں ہے کہ یوں کہا کہ میں نے آگ کو کلمہ پڑھنے کی

شمندی پر (ردوسا کے سامنے) ترجیح دی۔ پھر حضور ﷺ تو کمال شفقت سے استغفار کرنے لگے مگر یہ آیت نازل ہونے پر چھوڑ دیا "نبی اور ایمان والوں کے لیے جائز نہیں کہ مشرکین کے لیے استغفار کریں خواہ ان کے رشتہ دار بھی ہوں"۔ (سورۃ توبہ)

اور یہ آیت بھی نازل ہوئی

انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء

آپ ﷺ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ (قصص پارہ ۲۰ رکوع ۹)

۲۔ شیعہ تفسیر البرہان ج ۳ ص ۲۱ میں ہے کہ یہ آیت ابوطالب کے حق میں اتری۔

۳۔ ترجمہ مقبول شیعہ ص ۴۹۰ حاشیہ آیت بالا میں تفسیر قمی کے حوالے سے مذکور ہے کہ "یہ آیت حضرت ابوطالب عم رسول خدا ﷺ کی شان میں نازل ہوئی۔ آنحضرت ﷺ ان سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ چچا جان **لا الہ الا اللہ** کہہ دیجیے میں قیامت کے دن اس کے ذریعے آپ کو نفع پہنچاؤں گا اور وہ یہ کہا کرتے تھے کہ بھارے بھتیجے میں اپنی ذاتی حالت سے خوب واقف ہوں"۔

۴۔ اہل سنت کی فتح الباری ج ۷ ص ۱۴۸ پر حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ "جب ابوطالب مر گئے تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ﷺ کا گمراہ چچا مر گیا آپ ﷺ نے فرمایا دفن کر آؤ میں نے عرض کی وہ تو مشرک مرا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں، دفن کر آؤ"۔ یہ حدیث ابوداؤد و نسائی میں ہے۔ حافظ عسقلانیؒ اصابہ میں فرماتے ہیں "ابن خزیمہ نے اس حدیث کو صحیح بتلایا ہے"۔ (اصابہ ج ۴ ص ۱۱۷)

۵۔ "مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا" اس مسئلہ پر فقہاء نے استدلال موت ابی طالب سے کیا ہے کیونکہ ان کے چار بیٹے تھے طالب، عقیلؓ (فتح مکہ پر مسلمان ہوئے تھے)، جعفرؓ و علیؓ، ابوطالب کی میراث صرف طالب اور عقیل کو ملی جو (اس وقت) باپ کے مذہب (شرک) پر تھے۔ اور علیؓ و جعفرؓ کو نہیں ملی کہ یہ

دونوں مسلمان تھے۔(المعتمد فی المعتقد)

۲۔شیعہ بھی ان کے صرف باطنا مؤمن ہونے کے قائل ہیں۔مسلمان ہونے اور کلمہ پڑھنے کے قائل نہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی کسی روایت سے بھی ان کا کلمہ پڑھنا،خود کو مسلم کہنا یا مؤمن ہونے کا دعوے دار ہونا ہرگز ہرگز ثابت نہیں کر سکتے۔جب اسلام کے لیے اقرار شہادتین شرط ہے اور تبرا از کفار بھی ضروری ہے یہ دونوں باتیں ابوطالب میں نہ پائی گئیں تو ایمان کا دعویٰ بے بنیاد ثابت ہوا۔پھر شیعہ خدمات رسول ﷺ کی بناء پر آپ کو مومن نہیں کہتے۔بلکہ حضرت علیؓ کے باپ ہونے کی وجہ سے کہ امام کا باپ بھی مومن ہوتا ہے اور بعض غالی تو ان کو نبی مانتے ہیں اور بے دھڑک ''علیہ السلام'' استعمال کرتے ہیں۔خدا ایسے غلو اور شرک فی النبوت سے بچائے۔آمین!

حضرت حسنؓ کی بیعت معاویہؓ

یقیناً حضرت حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت کی تبھی تو شیعہ سیدنا حسنؓ سے ابھی تک ناراض ہیں اور ان کے کسی بھی کمال و کردار پر کوئی خصوصی تقریب یا مجلس منعقد نہیں کرتے۔ ثبوت ملاحظہ ہو

۱۔ کتاب احتجاج جلد ۲ ص ۱۲ میں روایت ہے کہ جب امام حسنؓ نے معاویہؓ کے ہاتھ پر صلح کر لی تو لوگ حاضر ہوئے اور بعضوں نے معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر آپؓ کو ملامت کی۔ حضرت حسنؓ نے فرمایا "تم پر افسوس ہے تم نہیں جانتے کہ میں نے تمہارے لیے کیا اچھا کام کیا۔ خدا کی قسم جو میں نے کیا وہ میرے شیعوں کے لیے بہتر ہے"۔

آیا نمی دانید که هیچ از ما نیست مگر آنکه ورگردن او بیعتے از خلیفه جو رے که در زمان اوست واقع می شود مگر قائم ما

کیا تم نہیں جانتے کہ قائم مہدی کے سوا ہم سب شیعہ امام اپنے اپنے زمانے کے خلیفہ جور کی بیعت اپنی گردن میں ڈالتے رہے ہیں۔ (جلاء العیون ص ۴۲۱ از باقر مجلسی، منتہی الآمال ج اص ۳۳۱ از عباس قمی)

۲۔ حضرت امیر معاویہؓ نے فوراً ان کی شرائط کو منظور کر لیا اس کے بعد انہوں نے (حضرت حسنؓ) اور ان کے ہمراہیوں نے بھی آکر بیعت کر لی۔ حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے کہا: "آپ حضرت حسینؓ سے اصرار نہ کریں، آپ کی بیعت کرنے کے مقابلہ میں ان کا اپنا فخر عزیز تر ہے"۔ یہ سن کر حضرت امیر معاویہؓ خاموش ہو گئے لیکن بعد میں پھر حضرت حسینؓ نے بھی حضرت امیر معاویہؓ سے بیعت کر لی۔ (تاریخ اسلام ج اص ۴۵۸ از اکبر شاہ نجیب آبادی)

جب حضرت حسنؓ نے حکومت حضرت معاویہؓ کو سونپ دی تو حضرت معاویہؓ نے چند شرائط پر کاربند رہنے کا تحریری عہد کیا۔ مختلف تاریخوں میں شرائط کی دفعات و تفصیلات میں اختلاف ہے۔ دینوری کا بیان اس باب میں زیادہ مستند ہے اور قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق مصالحت کی دفعات مندرجہ

ذیل تھیں:

۱۔ کسی عراقی کو محض پرانی عداوت کی بناء پر نہ پکڑا جائے۔

۲۔ بلا استثناء سب کو امان دی جائے۔

۳۔ اہل عراق کی بدزبانیوں کو انگیز کیا جائے۔

۴۔ دارالجرد کا پورا خراج حضرت حسنؓ کے لیے مخصوص کیا جائے۔

۵۔ حضرت حسینؓ کو دو لاکھ سالانہ دیے جائیں۔

۶۔ وظائف میں بنو ہاشم کو بنو امیہ پر ترجیح دی جائے۔

حضرت امیر معاویہؓ نے بلا کسی ترمیم کے یہ تمام شرطیں منظور کر لیں اور اپنے قلم سے اقرار نامہ لکھ کر اس پر مہر کر کے اکابر شام کی شہادتیں لکھوا کر عبیداللہ بن عامر کے ذریعہ حضرت حسنؓ کے پاس بھجوا دیا۔ (اخبار الطوال ص ۲۳۱ طبری بحوالہ تاریخ اسلام ندوی ج ۱ ص ۳۰۸)

شیعہ کی جلاء العیون ص ۲۵۴ اور منتہی الآمال ص ۲۳۰ پر ہے کہ حسنؓ بن علیؓ نے معاویہؓ بن ابوسفیانؓ کے ساتھ صلح کی ہے اور حسنؓ ان کا مقابلہ نہ کریں گے بشرطیکہ

۱۔ وہ لوگوں کے درمیان کتاب خدا، سنت رسول ﷺ اور سیرت خلفاء راشدین کے مطابق حکومت کریں۔

۲۔ اپنے بعد کسی شخص کو امر خلافت کے لیے مقرر نہ کریں۔

۳۔ شام، عراق، حجاز، یمن کے لوگ جہاں بھی رہیں اس کی گرفت سے بے فکر رہیں۔

۴۔ حضرت علیؓ کے اصحاب اور شیعہ اپنی جان، مال اور زن و اولاد سمیت محفوظ رہیں گے۔

ان شرائط پر حضرت معاویہؓ سے عہد و پیمان لیا گیا۔ (حضرت معاویہؓ ان شرائط پر کاربند رہے تبھی تو حضرت حسنؓ نے مقابلہ نہ کیا) ولی عہدی خود ان کی تھی بعض عمال کے مشورے اور پھر سب کی تائید سے کی تاکہ جھگڑا نہ پیدا ہو۔

باغ فدک کا مسئلہ

باغ فدک کا معاملہ بھی مدت تک معرکۃ الآرا رہا ہے۔ ایک گروہ (شیعہ) کا خیال ہے "باغ فدک خالص آنحضرت ﷺ کی جائیداد تھی کیونکہ اس پر چڑھائی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہاں کے لوگوں نے خود آپ ﷺ کے سپرد کر دیا تھا اور اس وجہ سے وہ اس آیت کے تحت میں داخل ہے

وما أفاء الله على رسوله منهم فما أوجفتم عليه من خيل ولا ركاب ولكن الله يسلط رسله على من يشاء والله على كل شيء قدير

جو کچھ خدا نے اپنے پیغمبر کو ان لوگوں سے دلوایا تو تم لوگ اس پر اونٹ یا گھوڑے دوڑا کر نہیں گئے تھے، لیکن خدا اپنے پیغمبر کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

"اور جب وہ آنحضرت ﷺ کی مملوکہ خاص ٹھہری تو اس میں وراثت کا عام قاعدہ جو قرآن مجید میں مذکور ہے، جاری ہوگا۔ اور آنحضرت ﷺ کے ورثاء اس کے مستحق ہوں گے، لیکن حضرت عمرؓ نے باوجود حضرت علیؓ کے طلب و تقاضا کے آل نبی ﷺ کو اس سے محروم رکھا"۔

یہ بحث اگرچہ، طرفین کے طبع آزمائیوں میں بہت بڑھ گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بات نہایت مختصر تھی، اور اب جب کہ سیاست مدن کے اصول زیادہ صاف اور عام فہم ہو گئے ہیں، یہ مسئلہ اس قابل بھی نہیں رہا کہ بحث کے دائرہ میں لایا جائے۔ اصل یہ ہے کہ نبی، امام یا بادشاہ کے قبضہ میں جو مال یا جائیداد ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک مملوکہ خاص جس کے حاصل ہونے میں نبوت اور امامت و بادشاہت کے منصب کو کچھ دخل نہیں ہوتا مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام، زرہ بنا کر معاش حاصل کرتے تھے یا عالمگیر قرآن لکھ کر بسر کرتے تھے۔ یہ آمدنی ان کی ذاتی آمدنی تھی اور اس پر ہر طرح کا ان کو اختیار تھا۔ دوسری مملوکہ حکومت ہے جیسا کہ

حضرت داؤد علیہ السلام کے مقبوضہ ممالک، جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضے میں آئے۔

اس دوسری قسم میں وراثت نہیں جاری ہوتی بلکہ جو شخص پیغمبری، امامت یا بادشاہت کی حیثیت سے جانشین ہوتا ہے وہی اس کا مالک یا متولی ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ آج کل کے مذاق کے موافق بالکل ایک بدیہی بات ہے۔ مثلاً سلطان عبد الحمید خان کے بعد ان کے ممالک مقبوضہ یا انکی جاگیر خالصہ ان کے بیٹے، بھائی، ماں، بہن وغیرہ میں تقسیم نہیں ہوگی بلکہ جو تخت نشین ہوگا وہ اس پر قابض ہوگا۔

مذہبی حیثیت سے بھی مسلمانوں کے ہر گروہ میں یہ قاعدہ ہمیشہ مسلم رہا۔ مثلاً جو لوگ باغ فدک کو درجہ بدرجہ ائمہ اثناء عشرہ کا حق سمجھتے ہیں وہ بھی اس میں وراثت کا قاعدہ نہیں جاری کرتے۔ مثلاً حضرت علی اپنے زمانے میں اس کے مالک ہوئے تو یہ نہیں ہوا کہ ان کی وفات کے بعد وراثت کا قاعدہ جاری ہوتا اور حسینؓ و عباسؓ و محمد بن حنفیہ و زینب وغیرہ کو جو حضرت علیؓ کے وارث تھے، اس کا کچھ حصہ بہام کے پڑتے سے ملتا، بلکہ صرف حضرت حسنؑ کے قبضہ میں آیا کیوں کہ امامت کی حیثیت سے وہی حضرت علیؑ کے جانشین تھے۔

غرض یہ عام اور مسلم قاعدہ ہے کہ جو جائیداد نبوت یا امامت یا بادشاہت کے منصب سے حاصل ہوتی ہے وہ مملوکہ خاص نہیں ہوتی۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ باغ فدک کیونکر حاصل ہوا تھا؟ اس کیفیت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب خیبر کی فتح سے واپس ہوئے تو محیصہ بن مسعود الانصاریؓ کو فدک والوں کے پاس تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا۔ فدک یہودیوں کے قبضہ میں تھا اور انکا سردار یوشع بن نون نامی ایک یہودی تھا۔ یہودیوں نے صلح کا پیام بھیجا اور معاوضہ صلح میں آدھی زمین دینی منظور کی۔ (فتوح البلدان۔ بلاذری۔ ذکر فدک) اس وقت سے یہ باغ، اسلام کے قبضہ میں آیا۔

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسی جائیداد آنحضرت ﷺ کی مملوکہ خاص کیونکر ہو سکتی ہے۔ فدک کی ملکیت خاص کا دعویٰ اس بناء پر کیا جاتا ہے کہ وہ فوج کے ذریعہ سے فتح نہیں ہوا بلکہ اس آیت کا مصداق ہے جو کہ درج ذیل ہے!

مما اوجفتم علیه من خیل ولا رکاب

لیکن کیا جو ممالک صلح کے ذریعہ سے قبضہ میں آتے ہیں وہ امام یا بادشاہ کی ملکیت خاص قرار پاتے ہیں؟ عرب کے اور مقامات بھی اس طرح قبضہ میں آئے کہ ان پر چڑھائی نہیں کرنی پڑی، کیا ان کو کسی نے آنحضرت ﷺ کی ملک خاص سمجھا؟ البتہ یہ امر غور طلب ہے کہ جب اور مقامات مفتوحہ کی نسبت کسی نے اس قسم کا کبھی خیال نہیں کیا تو فدک میں کیا خصوصیت تھی جس کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوئی؟ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اور مفتوحہ زمینیں اعلانیہ وقف عام رہیں لیکن فدک کو آنحضرت ﷺ نے اپنے مصارف کے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اس سے اس خیال کا موقع ملا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی جائیداد خاص ہے۔ اس خیال کی تائید زیادہ اس ہوئی کہ فدک پر لشکر کشی نہیں ہوئی تھی اور اس لیے اس پر اور لوگوں کو کسی قسم کا حق نہیں حاصل تھا لیکن یہ خیال دراصل صحیح نہیں۔ فدک کو بے شبہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ذاتی مصارف کے لیے خاص کر لیا تھا، لیکن کیونکر؟ اس کے متعلق تفصیلی روایتیں موجود ہیں۔

فكان نصف فدك خالصا لرسول الله وكان يصرف ما ياتيه منها الى ابناء السبيل (فتوح البلدان)

یعنی آدھا فدک، خاص رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ آنحضرت ﷺ اس میں سے مسافروں پر صرف کرتے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے:

ان فدك كانت للنبي ﷺ فكان ينفق منها وياكل ويعود على فقراء بني هاشم ويزوج ايمهم (فتوح البلدان)

یعنی فدک آنحضرت ﷺ کا تھا۔ آپ اس میں سے خرچ کرتے تھے اور فقراء بنی ہاشم کو دیتے تھے، اور ان کی بیواؤں کی شادی کرتے تھے۔

بخاری وغیرہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ سال بھر کا خرچ اس میں سے لیتے تھے۔ باقی

عام مسلمین کے مصالح میں دے دیتے تھے۔

ان روایتوں سے ظاہر ہے کہ فدک کا مملوکہ نبوت ہونا ایسا ہی تھا جیسا سلاطین کے لیے کوئی جائیداد خالصہ کر دی جاتی ہے۔ اس بناء پر باوجود مخصوص ہونے کے وقف کی حیثیت اس سے زائل نہیں ہوتی۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی ان اصول سے واقف تھے؟ اور اسی بناء پر انہوں نے فدک میں وراثت نہیں جاری کی یا کہ یہ نکات بعد الوقوع ہیں؟

عراق اور شام کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کے مجمع عام میں جو تقریر کی تھی اس میں قرآن مجید کی اس آیت **ما افاء الله على رسوله من اهل القرى فلله** الخ سے استدلال کر کے صاف کہہ دیا تھا کہ مقامات مفتوحہ کسی خاص شخص کی ملک نہیں ہیں بلکہ وقف عام ہیں۔ البتہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس آیت سے پہلے جو آیت ہے اس سے فدک وغیرہ کا آنحضرت ﷺ کی خاص جائیداد ہونا ثابت ہوتا ہے اور خود حضرت عمرؓ اس کے یہی معنی قرار دیتے تھے۔ آیت یہ ہے

وما افاء الله على رسوله منهم فما اوجفتم عليه من خيل ولاركاب ولكن الله يسلط رسله على من يشاء

اور جو کچھ ان لوگوں سے (یعنی یہود بنی نضیر) خدا نے اپنے پیغمبر کو دلوایا تو تم لوگ اس پر چڑھ کر نہیں گئے تھے، بلکہ خدا اپنے پیغمبروں کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس آیت کو پڑھ کر کہا تھا کہ۔

فكانت خالصة لرسول الله صلى الله عليه وسلم

اور یہ واقعہ صحیح بخاری، باب الخمس، باب المغازی اور باب المیراث میں بتفصیل موجود ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ اس آیت کی بناء پر فدک وغیرہ کو آنحضرت ﷺ کا خالصہ سمجھتے تھے لیکن

اسی قسم کا خالصہ جو ذاتی ملکیت نہیں ہوتا، جس طرح سلاطین کے مصارف کے لیے کوئی زمین خاص کر دی جاتی ہے کہ اس میں میراث کا عام قاعدہ نہیں جاری ہوتا بلکہ جو شخص جانشین سلطنت ہوتا ہے تنہا وہی ہو اس سے متمتع ہو سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے اس خیال کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے حسب آیت مذکورہ بالا کی بناء پر فدک کو آنحضرت ﷺ کا خالصہ کہا تو ساتھ ہی یہ الفاظ فرمائے جیسا کہ صحیح بخاری، باب الخمس وباب المغازی میں مذکور ہے۔

فكان رسول الله ينفق على اهله نفقة سنتهم من هذا المال ثم ياخذ ما بقي
فيجعله مجعل مال الله فعمل رسول الله بذالك حياته ثم توفي الله نبيه
صلى الله عليه وسلم فقال ابوبكر انا ولي رسول الله فقبضها ابوبكر فعمل
فيها بما عمل رسول الله ثم توفى الله ابابكر فكنت انا ولي ابي بكر
فقبضتها سنتين من امارتي اعمل فيها بما عمل رسول الله صلى الله عليه
وسلم و بما عمل فيها ابوبكر

آنحضرت ﷺ اس میں سے سال بھر کا خرچ لیتے تھے، باقی کو خدا کے مال کے طور پر خرچ کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے زندگی بھر اسی پر عمل کیا۔ پھر وفات پائی تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں ان کا جانشین ہوں پس اس پر قبضہ کیا اور اسی طرح کارروائی کی جس طرح رسول اللہ ﷺ کرتے تھے۔ انہوں نے وفات پائی تو میں ابوبکرؓ کا جانشین ہوں، پس میں نے اس پر دو برس قبضہ رکھا اور وہی کارروائی کی جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے۔

اس تقریر سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ باوجود اس کے کہ فدک وغیرہ کو خالصہ سمجھتے تھے، تاہم آنحضرت ﷺ کی ذاتی جائیداد نہیں سمجھتے تھے (کہ جس میں وراثت جاری ہو) اور اس وجہ سے اس کے قبضہ کا

مستحق صرف اس کو قرار دیتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کا جانشین ہو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اور خود اپنے قبضہ کی وجہ یہی بتائی۔

حضرت عمرؓ نے یہ تقریر اس وقت فرمائی تھی جب حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ ان کے پاس فدک کے دعویدار ہو کر آئے تھے اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اس میں وراثت کا قاعدہ نہیں جاری ہو سکتا۔

حاصل یہ کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک فدک وغیرہ آنحضرت ﷺ کے خالصہ بھی تھے اور وقف بھی تھے۔ چنانچہ عراق کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ نے اسی آیت کو جس سے آنحضرت ﷺ کا خالصہ ہونا پایا جاتا ہے پڑھ کر یہ الفاظ کہے

فهذه عامة في القرى كلها

یعنی جو حکم اس آیت میں ہے وہ انہی مواضع یعنی فدک وغیرہ پر محدود نہیں بلکہ تمام آبادیوں کو شامل ہے۔

اصل یہ ہے کے فدک کا دو جہتیں ہونا ہی تمام غلط فہمی کا منشاء تھا۔ چنانچہ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد جلد دوم صفحہ ۱۹۳ میں نہایت لطیف پیرایہ میں اس بات کو ادا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

فهو ملك يخالف حكم غيره من المالكين وهذا النوع من الأموال هو القسم الذي وقع بعده فيه من النزاع ما وقع إلى اليوم ولولا إشكال أمره عليهم لما طلبت فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم ميراثها من تركته و ظنت أنه يورث عنه ما كان ملكا له كسائر المالكين وخفي عليها رضي الله عنها حقيقة الملك الذي ليس مما يورث عنه

ان واقعات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان مسائل کو جو ابتداء سے آج تک معرکۃ الآراء رہے ہیں اور جن میں بڑے بڑے اکابر صحابہؓ کو اشتباہ ہوا، حضرت عمرؓ نے کس خوبی سے طے کیا کہ ایک طرف تو قرآن و حدیث کا صحیح محمل وہی ہو سکتا ہے اور دوسری طرف اصول سلطنت و نظام تمدن سے بالکل مطابقت رکھتا ہے۔

سقیفہ بنی ساعدہ (خلافت حضرت ابوبکرؓ)

یہ واقعہ بظاہر تعجب سے خالی نہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے انتقال فرمایا تو فوراً خلافت کا نزاع پیدا ہوگیا اور اس بات کا بھی انتظار نہ کیا گیا کہ پہلے رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین سے فراغت حاصل کرلی جائے، کس کے قیاس میں آسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ انتقال فرمائیں اور جن لوگوں کو ان کے عشق ومحبت کا دعویٰ ہو وہ ان کو بے گوروکفن چھوڑ کر چلے جائیں، اور اس بندوبست میں مصروف ہوں کہ مسند حکومت اوروں کے قبضے میں نہ آجائے۔

تعجب پر تعجب یہ ہے کہ یہ فعل ان لوگوں (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) سے سرزد ہوا جو آسمان اسلام کے مہر و ماہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس فعل کی ناگواری اس وقت اور زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو آنحضرت ﷺ سے فطری تعلق تھا، حضرت علیؓ وخاندان بنی ہاشم، ان پر فطرتی تعلق کا پورا اثر ہوا اور اس وجہ سے ان کو آنحضرت ﷺ کے دردوغم اور تجہیز وتکفین سے ان باتوں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ ملی۔

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ کتب حدیث وسیر سے بظاہر اسی قسم کا خیال پیدا ہوتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ، آنحضرت ﷺ کی تجہیز وتکفین چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ کو چلے گئے، یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے سقیفہ میں پہنچ کر خلافت کے باب میں انصار سے معرکہ آرائی کی اور اس طرح ان کی کوششوں میں مصروف رہے کہ گویا ان پر کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے اپنی خلافت کو نہ صرف انصار بلکہ بنو ہاشم اور حضرت علیؓ سے بھی بزور منوانا چاہا۔ گو بنو ہاشم نے آسانی سے ان کی خلافت تسلیم نہیں کی لیکن اس بحث میں غور طلب جو باتیں ہیں وہ یہ ہیں

ا۔ کیا خلافت کا سوال، حضرت عمرؓ وغیرہ نے چھیڑا تھا؟

۲۔ کیا یہ لوگ خود اپنی خواہش سے سقیفہ بنی ساعدہ میں گئے تھے؟

۳۔ کیا حضرت علیؓ اور بنو ہاشم خلافت کی فکر سے بالکل فارغ تھے؟

۴۔ ایسی حالت میں جو کچھ حضرت عمرؓ وغیرہ نے کیا، وہ کرنا چاہیے تھا یا نہیں؟

پہلی دو بحثوں کی نسبت ہم نہایت مستند کتاب، مسند ابو یعلیٰ کی عبارت نقل کرتے ہیں، جس سے واقعہ کی کیفیت بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔

بینما نحن فی منزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رجل ینادی من وراء الجدار ان اخرج الی یا ابن الخطاب فقلت الیک عنی فانا عنک مشاغیل یعنی بامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لہ قد حدث امر فان الانصار اجتمعوا فی سقیفۃ بنی ساعدۃ فادرکوھم ان یحدثوا امرا یکون فیہ حرب فقلت لابی بکر انطلق

حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے خانہ مبارک میں بیٹھے تھے کہ دفعتاً دیوار کے پیچھے سے ایک آدمی نے آواز دی کہ ابن الخطاب! ذرا باہر آؤ۔ میں نے کہا کہ چلو جاؤ، ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے بندوبست (تجہیز و تدفین) میں مشغول ہیں۔ اس نے کہا ایک حادثہ پیش آیا ہے یعنی انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس لیے جلد پہنچ کر ان کی خبر لو، ایسا نہ ہو کہ انصار کچھ ایسی بات کر اٹھیں جس سے لڑائی چھڑ جائے اس وقت میں نے ابوبکرؓ سے کہا کہ چلو"۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ نہ حضرت عمرؓ وغیرہ نے خلافت کی بحث کو چھیڑا تھا نہ وہ اپنی خوشی سے سقیفہ بنی ساعدہ کو جانا چاہتے تھے۔

تیسری بحث کی یہ کیفیت ہے کہ اس وقت جمعیت اسلامی تین گروہوں میں تقسیم کی جا سکتی تھی۔ بنو ہاشم، جس میں حضرت علیؓ شامل تھے۔ مہاجرین، جن کے رئیس و افسر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ تھے۔ انصار، جن کے

شیخ حضرت سعد بن عبادہؓ تھے۔ ان تینوں میں سے ایک گروہ بھی خلافت کے خیال سے خالی نہ تھا۔ انصار نے تو اعلانیہ اپنا ارادہ اظہار کر دیا تھا۔ بنو ہاشم کے خیالات ذیل کی روایت سے معلوم ہوں گے۔

"آنحضرت ﷺ کی وفات کے دن حضرت علیؓ مکان سے باہر نکلے، لوگوں نے ان سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج کیسا ہے؟ چوں کہ آنحضرت ﷺ کی ظاہری حالت بالکل سنبھل گئی تھی۔ حضرت علیؓ نے کہا "خدا کے فضل سے آپ ﷺ اچھے ہو گئے"۔ حضرت عباسؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ خدا کی قسم تم تین دن کے بعد غلامی کرو گے، میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ عنقریب اس مرض میں وفات پائیں گے، کیوں کہ مجھ کو اس کا تجربہ ہے کہ خاندان عبد المطلب کا چہرہ موت کے قریب کس طرح متغیر ہو جاتا ہے، آؤ چلو، رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لیں کہ آپ ﷺ کے بعد یہ منصب (خلافت) کس کو حاصل ہوگا" اگر ہم اس کے مستحق ہیں تو رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے وصیت فرمائیں گے" حضرت علیؓ نے فرمایا" میں نہ پوچھوں گا کیوں کہ اگر پوچھنے پر آنحضرت ﷺ نے انکار کر دیا تو پھر آئندہ کوئی امید نہیں رہے گی"۔ (صحیح بخاری، باب مرض النبی ﷺ مع فتح الباری)

اس روایت سے حضرت عباسؓ کا خیال تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کو آنحضرت ﷺ کی وفات کا اس وقت تک یقین نہ تھا اس لیے انہوں نے کوئی تحریک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے علاوہ ان کو اپنے انتخاب کیے جانے پر بھروسہ نہ تھا۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ کے گھر میں ایک مجمع ہوا جس میں تمام بنو ہاشم اور ان کے اتباع شریک تھے اور حضرت علیؓ ان کے پیش رو تھے۔

صحیح بخاری کتاب الحدود باب رجم الحبلی میں حضرت عمرؓ کی زبانی روایت ہے

کان من خبرنا حین توفی اللہ نبیہ ان الانصار خالفونا واجتمعوا باسرھم فی سقیفة

بنی ساعدة وخالف عنا علی والزبیر ومن معهما واجتمع المهاجرون الی ابی بکر

ہماری سرگزشت یہ ہے کہ جب خدا نے اپنے پیغمبر ﷺ کو اٹھا لیا تو انصار نے تمام تر ہماری مخالفت کی اور سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور علیؑ و زبیرؓ اور ان کے ساتھیوں نے مخالفت کی اور مہاجرین ابوبکرؓ کے پاس جمع ہوئے۔

یہ تقریر حضرت عمرؓ نے ایک بہت بڑے مجمع عام میں کی تھی جس میں سینکڑوں صحابہؓ موجود تھے۔ اس لیے اس بات کا گمان نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے کوئی امر خلاف واقع کہا ہو ورنہ لوگ ان کو وہیں ٹوکتے۔ امام مالکؒ کی روایت میں یہ واقعہ اور صاف ہوگیا، اس کے یہ الفاظ ہیں

وان علیا والزبیر ومن کان معهما تخلفوا فی بیت فاطمة بنت رسول الله

اور علیؑ و زبیرؓ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے۔ وہ حضرت فاطمہؑ کے گھر میں ہم سے الگ ہو کر جمع ہوئے۔ (فتح الباری شرح حدیث مذکور)

وتخلف علی والزبیر واخترط الزبیر سیفه وقال لا اغمده حتی یبایع علی

اور حضرت علیؑ و زبیرؓ نے علیحدگی اختیار کی اور زبیرؓ نے تلوار میان سے کھینچ لی اور کہا کہ جب تک علیؑ کے ہاتھ پر بیعت نہ کی جائے میں تلوار کو میان میں نہ ڈالوں گا۔ (تاریخ طبری ص ۱۸۲۰)

ان تمام روایتوں سے صاف یہ نتائج نکلتے ہیں کہ

۱۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی خلافت کے باب میں تین گروہ ہوگئے۔ انصار، مہاجرین اور بنو ہاشم۔

۲۔ مہاجرین حضرت ابوبکرؓ اور بنو ہاشم حضرت علیؑ کے ساتھ تھے۔

۴۔ جس طرح حضرت عمرؓ وغیرہ آنحضرت ﷺ کو چھوڑ کر سقیفہ کو چلے گئے تھے، حضرت علیؓ بھی آنحضرت ﷺ کے پاس سے چلے آئے تھے اور حضرت فاطمہؓ کے گھر میں بنو ہاشم کا مجمع ہوا تھا۔

سقیفہ میں حضرت علیؓ کا نہ جانا اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے غم والم میں مصروف تھے اور ان کو ایسے پر درد موقع پر خلافت کا خیال نہیں آسکا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ سقیفہ میں مہاجرین وانصار جمع تھے اور ان دونوں گروہوں میں سے کوئی حضرت علیؓ کے دعویٰ کی تائید نہ کرتا کیوں کہ مہاجرین حضرت ابوبکرؓ کو پیشوا تسلیم کرتے تھے اور انصار کے رئیس حضرت سعد بن عبادہؓ تھے۔

اخیر بحث یہ ہے کہ جو کچھ ہوا وہ بے جا تھا یا بجا؟ اس کو ہر شخص جو ذرا بھی اصول تمدن سے واقفیت رکھتا ہو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جس وقت وفات فرمائی مدینہ منورہ منافقوں سے بھرا ہوا پڑا تھا جو مدت سے اس بات کے منتظر تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ اٹھ جائے تو اسلام کو پامال کر دیں۔ اس نازک وقت میں آیا یہ ضروری تھا کہ لوگ جزع وفزع اور گریہ وزاری میں مصروف رہیں یا یہ کہ فوراً خلافت کا انتظام کر لیا جائے اور ایک منظم حالت قائم ہو جائے۔ انصار نے اپنی طرف سے خلافت کی بحث چھیڑ کر حالت کو اور نازک کر دیا کیونکہ قریش جو انصار کو اس قدر حقیر سمجھتے تھے کہ جنگ بدر میں جب انصار ان کے مقابلے میں نکلے تو عتبہ نے آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے کہا کہ "محمد ﷺ! ہم ناجنسوں سے نہیں لڑ سکتے" کسی طرح انصار کے آگے سر تسلیم خم نہیں کر سکتے تھے۔ قریش پر کیا موقوف ہے، تمام عرب کو انصار کی متابعت سے انکار ہوتا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ میں جو خطبہ دیا اس میں صاف اس خیال کو ظاہر کیا اور کہا

وان العرب لاتعرف هذا الامر الالهذا الحي من قريش

اس کے علاوہ انصار میں خود دو گروہ تھے اوس اور خزرج۔ اور ان میں باہم اتفاق نہ تھا اس حالت میں ضروری تھا کہ انصار کے دعویٰ خلافت کو دبا دیا جائے اور کوئی لائق شخص فوراً انتخاب کر لیا جائے۔ مجمع میں جو لوگ موجود

تھے ان میں سب سے بااثر بزرگ اور معمر حضرت ابوبکرؓ تھے اور فوراً ان کا انتخاب بھی ہو جاتا۔ لیکن لوگ انصار کی بحث و نزاع میں پھنس گئے تھے۔ اور بحث طول پکڑ کر قریب تھا کہ تلواریں میان سے نکل آئیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ رنگ دیکھ کر دفعتاً حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا کہ ''سب سے پہلے میں بیعت کرتا ہوں''۔ ساتھ ہی حضرت عثمانؓ، ابوعبیدہ بن جراحؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ نے بھی ہاتھ بڑھائے۔ (ابن الماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں لکھا ہے کہ اول صرف پانچ شخصوں نے بیعت کی تھی) اور پھر عام خلقت ٹوٹ پڑی۔ اس کارروائی سے ایک اٹھتا ہوا طوفان رک گیا اور لوگ مطمئن ہو کر کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ صرف بنو ہاشم اپنے ادعا پر رکے رہے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں وقتاً فوقتاً جمع ہو کر مشورے کرتے رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بزور ان سے بیعت لینا چاہی لیکن بنو ہاشم حضرت علیؓ کے سوا کسی کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور طبری نے تاریخ کبیر میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا 'یا بنت رسول اللہ ﷺ! خدا کی قسم آپ ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں تاہم اگر آپ کے یہاں لوگ اس طرح مجمع کرتے رہے تو میں ان لوگوں کی وجہ سے گھر میں آگ لگا دوں گا۔

اگرچہ سند کے اعتبار سے اس روایت پر ہم اپنا اعتبار ظاہر نہیں کر سکتے کیوں کہ اس روایت کے رواۃ کا حال ہم کو معلوم نہیں ہو سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نازک وقت میں حضرت عمرؓ نے نہایت تیزی اور سرگرمی کے ساتھ جو کارروائیاں کیں انہی نے اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیا۔ بنو ہاشم اگر اپنی بات پر قائم رہتے تو اسی وقت جمعیت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا۔ اور وہیں خانہ جنگیاں برپا ہو جاتیں جو آگے چل کر حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم میں واقع ہوئیں۔

حضرت عمرؓ اور حضرت ام کلثومؓ بنت علیؓ کا نکاح

اخیر عمر میں حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ خاندان نبوت سے تعلق پیدا کریں جو مزید شرف اور برکت کا سبب تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ سے حضرت ام کلثومؓ کیلیے درخواست کی، جناب ممدوح نے پہلے ام کلثومؓ کی صغر سنی کے سبب سے انکار کیا لیکن جب حضرت عمرؓ نے زیادہ تمنا ظاہر کی اور کہا کہ اس سے مجھ کو حصول شرف مقصود ہے تو جناب علیؓ نے منظور فرمایا اور ۱۷ھ میں ۴۰ ہزار مہر پر نکاح ہوا۔

حضرت ام کلثومؓ بنت فاطمہؓ کی تزویج کا واقعہ تمام معتمد مورخوں نے بتفصیل لکھا ہے۔ طبری نے تاریخ کبیر میں، ابن حبان نے کتاب الثقاۃ میں، ابن قتیبہ نے معارف میں، ابن اثیر نے کامل میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ ام کلثومؓ بنت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما، حضرت عمرؓ کی زوجہ تھیں۔ ایک دوسری ام کلثوم بھی ان کی زوجہ تھیں لیکن ان دونوں میں مورخوں نے صاف تفریق کی ہے۔ علامہ طبری و ابن حبان و ابن قتیبہ سے بڑھ کر تاریخی واقعات کے لیے اور کیا سند ہو سکتی ہے۔ ان میں سے خاص عبارتیں اس موقع پر نقل کی جاتی ہیں۔ ثقات ابن حبان، ذکر خلافت عمرؓ واقعات ۱۷ھ میں مذکور ہے کہ

ثم تزوج عمر ام کلثوم بنت علی ابن ابی طالب وھی من فاطمہ ودخل بھا فی شھر ذی القعدہ

معارف ابن قتیبہ، ذکر اولاد عمرؓ میں ہے

وفاطمہ وزید وامھما ام کلثوم بنت علیؓ بن ابی طالب من فاطمۃ بنت رسول اللہ

اسد الغابہ فی احوال الصحابہ لابن اثیر میں جہاں حضرت ام کلثومؓ کا حال لکھا ہے تفصیل کے ساتھ ان کی تزویج کا واقعہ نقل کیا ہے۔ اسی طرح طبری نے بھی جا بجا تصریح کی ہے جس کو ہم تطویل کے خوف سے قلم انداز

کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ صحیح بخاری میں ایک ضمنی موقع پر حضرت ام کلثوم ؓ کا ذکر آ گیا ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ عورتوں کو چادریں تقسیم کیں۔ ایک بچ رہی۔ اس کی نسبت ان کو تردد تھا کہ کس کو دی جائے۔ ایک شخص نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

یا امیرالمؤمنین اعط ھذا بنت رسول اللہ ﷺ التی عندک یریدون ام کلثوم

(صحیح بخاری باب الجہاد، مطبوعہ میرٹھ ص ۴۰۳)

لہٰذا، اس میں صاف تصریح ہے کہ حضرت ام کلثوم ؓ جو کہ حضرت عمر ؓ کی زوجہ تھیں، خاندانِ نبوت سے تھیں۔ حضرت عمر ؓ کی اور بیویاں بھی تھیں، یعنی ام حکیم بنت حارث بن ہشام المخزومی، فکیہۃ یمیہ، عاتکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل۔ عاتکہ، حضرت عمرؓ کی چچیری بہن تھیں، ان کا نکاح پہلے حضرت ابوبکر ؓ کے فرزند عبداللہؓ سے ہوا تھا، عبداللہ غزوہ طائف میں شہید ہو گئے۔ عاتکہ نے ان کا نہایت دردانگیز مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

فالیت لاتنفک عینی حزینۃ علیک ولا ینفک جلدی اغبرا

میں نے قسم کھائی ہے کہ میری آنکھ ہمیشہ تجھ پر غمگین رہے گی اور بدن خاک آلودہ رہے گا۔

حضرت عمرؓ کی اولاد کثرت سے ہوئی جن میں سے حضرت حفصہؓ اس لیے زیادہ ممتاز ہیں کہ وہ ازواج مطہرات میں سے ہیں۔ ان کا نکاح پہلے خنیس بن حذافہؓ کے ساتھ ہوا تھا جو مہاجرین صحابہؓ میں سے تھے۔ خنیس جب غزوہ احد میں شہید ہوئے تو وہ ۳ھ میں رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں، اور بہت سے صحابہؓ نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ ۴۵ھ میں ۶۳ برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔

واقعہ قرطاس (کاغذ قلم)

بیماری کا بڑا مشہور واقعہ قرطاس کا واقعہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے وفات سے تین روز پہلے قلم اور دوات طلب کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے لیے ایسی چیز لکھوں کا کہ تم آئندہ گمراہ نہ ہو گے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آنحضرت کو درد کی شدت ہے اور ہمارے لیے قرآن کافی ہے۔ حاضرین میں سے بعضوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ بہکی باتیں کر رہے ہیں (نعوذ باللہ)۔ (روایت میں **ھجر** کا لفظ ہے جسکے معنی ہذیان کے ہیں)

یہ واقعہ بظاہر تعجب انگیز ہے۔ ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ اس زیادہ اور کیا گستاخی اور سرکشی ہوگی کہ جناب رسول اللہ ﷺ بستر مرگ پر اور امت کے درد و غم خواری کے لحاظ سے فرماتے ہیں "کہ لاؤ میں ایک ہدایت نامہ لکھ دوں جو تم کو گمراہی سے محفوظ رکھے"۔ یہ ظاہر ہے کہ گمراہی سے بچانے کے لیے جو ہدایت ہوں وہ منصب نبوت کے لحاظ سے ہوگی اور اس لیے اس میں سہو و خطا کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ باوجود اس کہ حضرت عمرؓ بے پرواہی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچھ ضرورت نہیں، ہم کو قرآن کافی ہے طرہ یہ کہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ ہی نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کو ہذیان سے تعبیر کیا تھا" (نعوذ باللہ)۔

یہ اعتراض ایک مدت سے چلا آرہا ہے اور مختلف گروہوں نے اس پر بڑی طبع آزمائیاں کی ہیں۔ لیکن چونکہ اس بحث میں غیر متعلق باتیں چھڑ گئیں اور اصول درایت سے کسی نے کام نہیں لیا اس لیے اصل مسئلہ نا منفصل رہا اور عجیب عجیب بے کار بحثیں پیدا ہو گئیں۔ یہاں تک کہ یہ مسئلہ چھیڑ آگیا کہ پیغمبر ﷺ سے ہذیان ہو ناممکن ہے کیوں کہ ہذیان انسانی عوارض میں ہے اور آنحضرت ﷺ عوارض انسانی سے بری نہ تھے۔

یہاں دراصل یہ امر غور طلب ہے کہ جو واقعہ جس طریقے سے روایتوں میں منقول ہے اس سے کسی امر پر استناد ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس بحث کے لیے پہلے واقعات ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیے

۱۔ آنحضرت ﷺ کم و بیش ۱۳ دن تک بیمار رہے۔

۲۔ کاغذ و قلم طلب کرنے کا واقعہ جمعرات کے دن کا ہے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بتصریح مذکور ہے

اور چونکہ آنحضرت ﷺ نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا اس لیے اس واقعہ کے بعد آنحضرت ﷺ ۴ دن تک زندہ رہے۔

۳۔ اس تمام مدت بیماری میں آنحضرت ﷺ کی نسبت، اور کوئی واقعہ اختلال حواس کا کسی روایت میں کہیں مذکور نہیں۔

۴۔ اس واقعہ کے وقت کثرت سے صحابہؓ موجود تھے لیکن یہ حدیث باوجود اس کے بہت سے طریقوں سے مروی ہے (چنانچہ صرف صحیح بخاری میں ۷ طریقوں سے مذکور ہے) با ایں ہمہ بجز حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے اور کسی صحابیؓ سے اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں۔

۵۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی عمر اس وقت صرف ۱۳، ۱۴ برس کی تھی۔

۶۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس موقع پر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم خود موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انہوں نے کس سے سنا [1]

۷۔ تمام روایتوں میں مذکور ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے کاغذ قلم مانگا تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ بہکی ہوئی باتیں کر رہے ہیں [2]

---

[1] بخاری باب کتابۃ العلم میں جو حدیث مذکور ہے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اس واقعہ میں موجود تھے۔ اس لیے محدثین نے اس پر بحث کی ہے اور بہ دلائل قطعیہ ثابت کیا ہے کہ وہ موجود نہ تھے۔ تفصیل فتح الباری باب کتابۃ العلم

[2] علامہ قرطبی نے یہ تاویل کی ہے اور اس پر ان کو ناز ہے کہ لوگوں نے یہ لفظ انکار اور استعجاب کے طور پر کہا تھا یعنی یہ کہ آنحضرت ﷺ کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔ حدانخواستہ آنحضرت ﷺ کا قول ہذیان تو نہیں کہ اس پر لحاظ نہ کیا جائے۔ یہ تاویل لگتی ہوئی ہے۔ لیکن بخاری ومسلم کی بعض روایتوں میں ایسے صاف الفاظ ہیں جن میں اس تاویل کا احتمال نہیں مثلاً
هجر هجر (دو دفعہ) ما ان رسول الله صلى الله عليه وسلم يهجر (صحیح مسلم)

اب سب سے پہلے یہ امر لحاظ کے قابل ہے کہ جب اور کوئی واقعہ یا قرینہ آنحضرت ﷺ کے اختلال حواس کا کہیں کسی روایت میں مذکور نہیں، تو صرف اس قدر کہنے سے کہ ''قلم دوات لاؤ'' لوگوں کو ہذیان کا خیال کیونکر پیدا ہو سکتا تھا؟ فرض کرلو کہ انبیاء علیہم السلام سے ہذیان سرزد ہو سکتا ہے لیکن اس کے یہ تو معنی نہیں کہ وہ معمولی بات بھی کہیں تو ہذیان سمجھی جائے۔ ایک پیغمبر ﷺ کا وفات کے قریب یہ کہنا کہ ''قلم دوات لاؤ میں ایسی چیز لکھ دوں کہ تم آئندہ گمراہ نہ ہو'' اس میں ہذیان کی کیا بات ہے؟ [1]

یہ روایت اگر خواہ مخواہ صحیح سمجھی جائے تب بھی اس قدر بہرحال تسلیم کرنا ہوگا کہ راوی نے روایت میں وہ واقعات چھوڑ دیے ہیں جن سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ آنحضرت ﷺ ہوش میں نہیں ہیں اور بے ہوشی کی حالت میں قلم دوات طلب فرما رہے ہیں۔ پس ایسی روایت سے جس میں کہ راوی نے واقعہ کی نہایت ضروری خصوصیات چھوڑ دیں، کسی واقعہ پر کیونکر استدلال ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ جب ان امور کا لحاظ کیا جائے کہ اتنے بڑے عظیم الشان واقعہ میں تمام صحابہ میں سے صرف حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اس کے راوی ہیں۔ اور یہ کہ ان کی عمر اس وقت ۱۳-۱۴ برس کی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود واقعہ کے وقت موجود نہ تھے۔ تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس روایت کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے، ممکن ہے کہ کسی کوتاہ نظر پر یہ امر گراں گزرے کہ بخاری اور مسلم کی حدیث پر شبہ کیا جائے لیکن اس کو سمجھنا چاہیے کہ بخاری اور مسلم کے کسی راوی کی نسبت یہ شبہ کرنا کہ وہ واقعہ کی پوری ہیئت محفوظ نہ رکھ سکا، اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہذیان اور حضرت عمرؓ کی نسبت گستاخی کا الزام لگایا جائے۔

غرض آنحضرت ﷺ اس واقعہ کے بعد چار دن تک زندہ رہے اور اس اثناء میں وقتاً فوقتاً بہت سی ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں، بلکہ وفات کے دن آپ ﷺ کی حالت اس قدر سنبھل گئی تھی کہ لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی بالکل صحت کا گمان ہو گیا۔

---

[1] ہمارے نکتہ سنجوں نے یہ مضمون آفرینی کی ہے کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ لکھنا نہیں جانتے تھے اس لیے آپ کا یہ فرمانا ''کہ میں لکھ دوں'' ہذیان کا قرینہ تھا لیکن ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ لکھنے کے معنی لکھوانے کے بھی آتے ہیں اور یہ مجاز شائع اور ذائع ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اسی خیال سے اپنے مکان کو جو مدینہ منورہ سے ۲ میل پر تھا واپس چلے گئے [۲]
لیکن حضرت عمرؓ وفات کے وقت تک موجود رہے۔ آنحضرت ﷺ نے ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ دوشنبہ کے دن دوپہر کے وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں انتقال کیا اور سہ شنبہ کو دوپہر ڈھلنے پر مدفون ہوئے۔ جماعت اسلام کو آپ ﷺ کی وفات سے جو صدمہ ہوا اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ عام روایت ہے کہ حضرت عمرؓ اس قدر خود رفتہ ہوئے کہ مسجد نبوی ﷺ میں جا کر اعلان کیا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرت ﷺ نے وفات پائی اس کو قتل کر ڈالوں گا، لیکن اور قرائن اس روایت کی تصدیق نہیں کرتے۔

ہمارے نزدیک چونکہ مدینے میں کثرت سے منافقین کا گروہ موجود تھا جو فتنہ پردازی کے لیے آنحضرت ﷺ کی وفات کا منتظر تھا، اس لیے حضرت عمرؓ نے مصلحتاً اس خبر کے پھیلنے کو روکا ہو گا اسی واقعہ نے روایتوں کے تغیرات سے مختلف صورت اختیار کرلی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ میں اس قسم کی تصریحات موجود ہیں جو ہمارے اس قیاس سے مطابق نہیں ہوسکتیں۔

---

[۲] طبری صفحہ ۱۸۱۴

حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کا جنازہ پڑھا

حضرت علیؓ وفات عمرؓ کے وقت مدینہ میں تھے اور اپنے داماد کا جنازہ بھی پڑھا۔ معتبر شہادت یہ ہے:

فلما مات عمر رضی اللہ عنہ واحضرت جنازتہ تبادرا لیھا علی وعثمان رضی اللہ عنھما ایھما یصلی علیہ فقال لھما عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ لستما من ھذا فی شیء انما ھذا الی صھیب رضی اللہ عنہ الذی امرہ عمر رضی اللہ عنہ ان یصلی بالناس فتقدم صھیب رضی اللہ عنہ فصلی علیہ

"جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ وفات پا گئے اور جنازہ حاضر ہو گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہم اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم جنازہ پڑھانے کے لیے لپکے تو عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم نے کہا تم دونوں نہیں پڑھا سکتے یہ صرف حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا حق ہے جسے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہم نے (بطور وصیت) حکم دیا ہے کہ وہ نماز پڑھائے چنانچہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی"۔ (البدایہ ج ۷ ص ۱۴۵ بیروت)

لہٰذا حضرت علیؓ اپنے داماد حضرت عمرؓ کے جنازہ سے محروم نہ رہے بلکہ خوب خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ بخاری ج ۱ ص ۵۲۰، مسلم کتاب المناقب میں ہے

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا جنازہ رکھا ہوا تھا لوگ اسکو گھیرے ہوئے تھے۔ دعائیں دیتے اور صلوۃ بھیجتے تھے۔ میں بھی ان میں تھا۔ مجھے ایک شخص نے اچانک ڈرا دیا جب اس نے میرا کندھا پکڑا تو وہ حضرت علیؓ تھے جو حضرت عمرؓ پر دعائے رحمت بھیجتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ نے اپنے بعد ایسا کوئی شخص نہیں چھوڑا جو آپ جیسے اعمال لے کر اللہ سے ملے اور مجھے سب سے زیادہ پسند ہو (یعنی آپ کے بعد کوئی اور آپ سے افضل نہیں) اللہ کی قسم! میں یقیناً یہ گمان رکھتا تھا کہ اللہ آپ کو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ (قبروں میں اور جنت میں) اکھٹا کرے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بہت دفعہ حضور ﷺ سے سن رکھا ہے، آپ ﷺ فرماتے تھے میں چلا اور ابوبکرؓ و عمرؓ چلے۔ میں داخل ہوا اور ابوبکرؓ و عمرؓ داخل ہوئے، میں نکلا اور ابوبکرؓ و عمرؓ نکلے۔ (یعنی دنیا سے غیر محسوس احوال سامنے میں شیخینؓ کی حضور ﷺ کے ساتھ کمال شرکت تھی) تو اب برزخ میں بھی شریک رہیں گے۔ گویا حضرت علیؓ نے ہی حضور ﷺ کے ساتھ تدفین کا مشورہ دیا"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم

مودودی صاحب نے اپنی کتاب "خلافت و ملوکیت" میں "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ:

"ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے حتیٰ کہ مسجد نبوی ﷺ میں منبر رسول ﷺ پر عین روضہ نبوی ﷺ کے سامنے حضور ﷺ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے، کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف ہے اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے آکر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اس روایت کو بھی بدلا اور خطبہ جمعہ میں سب علی کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کر دی **ان اللہ یامر بالعدل والاحسان ... الخ**"۔ (ص ۱۷۴)

مودودی صاحب نے اس عبارت میں تین دعوے کیے ہیں، ایک یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر خود سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، دوسرا یہ کہ ان کے تمام گورنر یہ حرکت کرتے تھے، تیسرا یہ کہ یہ گورنر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ایسا کرتے تھے۔ اب تینوں دعووں کا اصل ماخذ میں مطالعہ کیجیے!

جہاں تک پہلے دعوے کا تعلق ہے سو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس "مکروہ بدعت" کو منسوب کرنے کے لیے انہوں نے تین کتابوں کے پانچ حوالے پیش کیے ہیں۔ (طبری ج ۴ ص ۱۸۸، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۳۴۔ ج ۴ ص ۱۵۴، البدایہ ج ۹ ص ۸۰) ہم نے ان میں سے ایک ایک حوالہ کو صرف مذکورہ صفحات ہی پر نہیں بلکہ ان کے آس پاس بھی بنظرِ غائر دیکھا، ہمیں کسی بھی کتاب میں یہ کہیں نہیں ملا کہ حضرت

معاویہ رضی اللہ عنہ "خود" حضرت علی رضی اللہ عنہ پر برسر منبر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے لیکن چونکہ مودودی صاحب نے تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ اس "انسانی اخلاق کے خلاف" فعل کا ارتکاب وہ "خود" کیا کرتے تھے۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ شاید مودودی صاحب نے ایسی کوئی روایت کسی اور مقام پر دیکھ لی ہو اور اس کا حوالہ دینا بھول گئے ہوں، چنانچہ ہم نے مذکورہ تمام کتابوں کے متوقع مقامات پر دیر تک جستجو کی کہ شاید کوئی گری پڑی روایت ایسی مل جائے لیکن یقین فرمایے کہ ایسی کوئی بات ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملی۔ پھر بعض ان تواریخ کی طرف بھی رجوع کیا جن کے بارے میں مودودی صاحب کو اعتراف ہے کہ ان کے مصنف شیعہ تھے۔ مثلاً مسعودی کی مروج الذہب، لیکن اس میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ملی۔

اس کے برعکس اس جستجو کے دوران ایسی متعدد روایات ہمیں ملیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کے باوجود ان کا کس قدر احترام کرتے تھے؟ ان میں چند روایات ملاحظہ فرمایے

۱۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں

لما جاء خبر قتل علی رضی اللہ عنہ الی معاویہ رضی اللہ عنہ جعل یبکی فقالت لہ امراتہ اتبکیہ وقد قاتلتہ فقال ویحک انک لا تدرین ما فقد الناس من الفضل والفقہ والعلم

"جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل ہونے کی خبر ملی تو وہ رونے لگے۔ ان کی اہلیہ نے ان سے کہا کہ آپ اب ان کو روتے ہیں حالانکہ زندگی میں ان سے لڑ چکے ہیں؟ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہیں پتہ نہیں کہ آج لوگ کتنے علم وفضل اور فقہ سے محروم ہو گئے۔" (البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۱۳۰)

یہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ نے یہ اعتراض تو کیا کہ اب آپ انہیں کیوں روتے ہیں جب کہ زندگی میں ان سے لڑتے رہے لیکن یہ نہیں کہا کہ زندگی میں تو آپ ان پر سب وشتم کیا کرتے تھے، اب

ان پر کیوں روتے ہیں؟

۲۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ برا بھلا کہا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس پر انہیں توبیخ کرتے ہوئے فرمایا

تشتم علیا وھو جدہ

"تم علی رضی اللہ عنہ کو گالی دیتے ہو حالانکہ وہ ان کے دادا ہیں۔" ۔ الطبری، ج ۴، ص ۲۴۸، مطبعۃ الاستقامہ بالقاہرہ ۱۳۵۸ھ۔ الکامل لابن اثیر، ج ۳، ص ۷۵

۳۔ علامہ ابن اثیر جزری نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا جو آخری خطبہ نقل کیا ہے، اس میں ان کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ

لن یاتیکم من بعدی الا من انا خیر منہ کما ان من قبلی کان خیر امنی

"میرے بعد تمہارے پاس (جو خلیفہ) بھی آئے گا، میں اس سے بہتر ہوں گا، جس طرح مجھ سے پہلے جتنے (خلفاء) تھے مجھ سے بہتر تھے۔" ۔ الکامل لابن اثیر، ج ۴، ص ۴

۴۔ علامہ ابن عبد البر نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ضرار صدائی سے کہا کہ "میرے سامنے علی رضی اللہ عنہ کے اوصاف بیان کرو" ضرار صدائی نے بڑے بلیغ الفاظ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی تعریفیں کیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سنتے رہے اور آخر میں رو پڑے، پھر فرمایا

رحم اللہ ابا الحسن کان واللہ کذالک

"اللہ ابوالحسن (علی رضی اللہ عنہ) پر رحم کرے، خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے"۔ ۔ الاستیعاب تحت الاساب، ج ۳، ص ۴۳، ۴۴، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ۔ القاہرہ ۱۹۳۰ء

نیز حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مختلف فقہی مسائل میں حضرت علی رضی اللہ

عنہ سے خط وکتابت کے ذریعے معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

ذهب الفقه والعلم بموت ابن ابي طالب رضي الله عنه

"ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی موت سے فقہ اور علم رخصت ہو گئے"۔ (الاستیعاب تحت الاصابہ، ص ۴۵، ج ۳، ذکر سیدنا علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب)

غرض اس جستجو کے دوران ہمیں اس قسم کی تو کئی روایتیں ملیں، لیکن کوئی ایک روایت بھی ایسی نہ مل سکی جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (معاذ اللہ) خطبوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مودودی صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام کس بنیاد پر کس دل سے عائد کیا ہے؟ پھر دوسرا دعویٰ انہوں نے یہ کیا ہے کہ "ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں، برمنبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے"۔

ظاہر ہے کہ ان کا یہ دعویٰ اس وقت تو ثابت ہو سکتا ہے جب وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے "تمام گورنروں" کی ایک فہرست جمع فرما کر ہر ایک گورنر کے بارے میں یہ ثابت فرمائیں کہ ان میں سے ہر ایک نے انفرادی یا اجتماعی طور پر (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دی تھیں، نیز اس بات کا بھی ثبوت ان کے پاس ہو کہ ان میں سے ہر ایک کو انفرادی یا اجتماعی طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کیا کرو۔

لیکن اپنے اس الزام کی تائید میں جو حوالے مودودی صاحب نے پیش کیے ہیں ہم نے ان کی طرف رجوع کیا تو ان میں سے ایک بات بھی صحیح ثابت نہیں ہو سکی۔ اول تو یہ سمجھ لیجیے کہ مودودی صاحب کے دیے ہوئے پانچ حوالوں میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے صرف دو گورنروں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کیا کرتے تھے، ایک حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے مروان بن الحکم، (طبری، ص ۱۸۸، ج ۴ اور کامل ابن اثیر، ص ۲۳۴، ج ۳) کا حوالہ مودودی صاحب نے حضرت مغیرہ بن

شعبہ رضی اللہ عنہ سے متعلق دیا ہے اور البدایہ، ص ۲۵۹، ج ۹ کا حوالہ مروان بن الحکم سے متعلق ہے۔ رہ گیا البدایہ، ص ۸۰، ج ۹ کا حوالہ سو اس میں حجاج بن یوسف کے بھائی محمد بن یوسف الثقفی کا ذکر ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نہیں بلکہ ان کے بہت بعد ولید بن عبد الملک کا گورنر تھا۔ اسی طرح ابن اثیر، ص ۱۵۴، ج ۴ ہنو امیہ کے خلفاء کا عمومی تذکرہ ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا ان کے کسی گورنر کا نہیں)۔ اگر ان روایات کو تھوڑی دیر کے لیے درست مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دو گورنروں پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا کرتے تھے۔ اس سے آخر یہ کیسے لازم آ گیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے "تمام گورنر" خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ایسا کیا کرتے تھے۔ یہ "تمام گورنر" کا الزام تو ایسا ہے کہ اسے شاید کسی موضوع روایتوں کے مجموعے سے بھی ثابت نہ کیا جا سکے۔

اس کے بعد اب ان دو روایتوں کی حقیقت بھی جان لیجیے جن میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور مروان بن الحکم کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کیا کرتے تھے۔

پہلی روایت اصلاً علامہ ابن جریر طبری نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کی ہے اور انہیں سے نقل کر کے ابن اثیر جزری نے اپنی تاریخ الکامل میں اسے درج کر دیا ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں

قال هشام بن محمد عن ابی مخنف عن المجالد بن سعيد والصقعب بن زهير و فضيل بن خديج والحسين بن عقبه المرادی قال كل قد حدثنی بعض هذا الحديث فاجتمع حديثهم فيما سقت من حديث حجر بن عدی الكندی واصحابه ان معاويه رضی الله عنه بن ابی سفيان رضی الله عنه لما ولی المغيرة بن شعبه رضی الله عنه فی جمادی سنه ٤١ دعاه فحمد الله واثنی عليه ثم قال اما بعد وقد اردت ايصاك باشياء كثيرة فانا تاركها اعتمادا علی بصرك بما يرضينی ويسعد سلطانی ويصلح به رعيتی ولست تاركا ايصاءك بخصلة

لا تتحم عن شتم علي رضي الله عنه وذمه والترحم على عثمان رضي الله عنه والاستغفار له والعيب على أصحاب علي رضي الله عنه والاقصاء لهم وترك الاستماع منهم. قال أبو مخنف قال الصقعب بن زهير سمعت الشعبي يقول قال وأقام المغيرة رضي الله عنه على الكوفة عاملا لمعاوية رضي الله عنه سبع سنين وأشهرا وهو من أحسن شيء سيرة وأشده حبا للعافية غير أنه لا يدع ذم علي رضي الله عنه والوقوع فيه.

"ہشام بن محمد نے ابومخنف سے اور انہوں نے مجالد بن سعید صقعب ابن زہیر فضیل بن خدیج اور حسین بن عقبہ مرادی سے روایت کیا ہے کہ ابومخنف کہتے ہیں کہ ان چاروں نے مجھے آئندہ واقعہ کے تھوڑے تھوڑے ٹکڑے سنائے، لہذا حجر بن عدی کندی کا جو واقعہ میں آگے سنا رہا ہوں اس میں ان چاروں کی مختلف روایتیں جمع ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ماہ جمادی ۴۱ھ میں معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے کوفہ پر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو گورنر بنایا تو انہیں بلا کر پہلے اللہ کی حمد وثناء کی۔ پھر کہا کہ "میرا ارادہ تھا کہ میں تمہیں بہت چیزوں کی نصیحت کروں، لیکن چونکہ مجھے اعتماد ہے کہ تم مجھے راضی رکھتے، میری سلطنت کو کامیاب بنانے اور میری رعایا کی اصلاح کرنے پر پوری نظر رکھتے ہو، اس لیے میں ان تمام باتوں کو چھوڑتا ہوں۔ البتہ تمہیں ایک نصیحت کرنا میں ترک نہیں کر سکتا وہ یہ کہ علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کرنے اور انہیں گالی دینے سے پرہیز نہ کرنا، عثمان رضی اللہ عنہ پر رحمت بھیجتے رہنا اور ان کے لیے استغفار کرتے رہنا۔ علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب پر عیب لگانا، انہیں دور رکھنا اور ان کی بات نہ سننا، عثمان رضی اللہ عنہ کے اصحاب کی خوب تعریف کرنا، انہیں قریب رکھنا اور ان کی باتیں سنا کرنا"۔ ابومخنف کہتا ہے کہ صقعب بن زہیر نے کہا کہ میں نے شعبی کو کہتے ہوئے سنا کہ "مغیرہ رضی اللہ عنہ کوفہ میں، معاویہ رضی اللہ عنہ کے عامل کی حیثیت سے سات سال اور کچھ مہینے رہے وہ بہترین سیرت کے مالک تھے اور عافیت کو تمام لوگوں سے پسند کرتے تھے، البتہ وہ علی رضی اللہ عنہ کی مذمت اور انہیں برا بھلا کہنا نہیں

لعن طعن سے تعبیر کر دیا ہے۔ظاہر ہے کہ جب راوی حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ صراحتاً نقل کر رہے ہیں تو فیصلہ ان الفاظ پر کیا جائے گا نہ کہ اس تاثر پر جو ان الفاظ سے راویوں نے لیا، یا اس تعبیر پر "روایت بالمعنیٰ" میں انہوں نے اختیار کی۔

پھر دوسری اہم ترین بات یہ ہے کہ ابن جریر نے یہ روایت جس سند کے ساتھ نقل کی ہے، وہ اول سے آخر تک شیعہ یا کذاب اور جھوٹے راویوں پر مشتمل ہے۔اس روایت کا پہلا راوی ہشام بن الکلبی ہے جو مشہور راوی محمد بن السائب الکلبی کا بیٹا ہے، اس کے بارے میں ابن عساکر کا قول ہے کہ:

رافضی لیس بثقة

وہ رافضی ہے، ثقہ نہیں۔ (لسان المیزان، ج ٦،ص ١٩٦، دائرۃ المعارف ١٣٣٠ھ)

اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن ابی طی نے اسے امامیہ (شیعوں کا ایک فرقہ) میں شمار کیا ہے اور ابن ابی یعقوب حربی "فرماتے ہیں کہ

راویة للمثالب عامة

انتہا درجے کی مثالب روایت کرتا ہے

پھر دوسرا راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ ہے، اس کے بارے میں حافظ ابن عدی فرماتے ہیں

شیعی محترق صاحب اخبارھم

جلا بھنا شیعہ ہے اور انہی کی روایت کا ذکر کرتا ہے۔ (لسان المیزان، ج ٦،ص ١٩٧، دائرۃ المعارف ١٣٣٠ھ)

تیسرا راوی مجالد بن سعید ہے، ان کے ضعیف ہونے پر تو تمام ائمہ حدیث کا اتفاق ہے ہی، یہاں تک کہ تاریخی روایات میں بھی انہیں ضعیف مانا گیا ہے۔امام یحییٰ بن سعید قطانؒ کے کوئی دوست کہیں جا رہے تھے، انہوں نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟" انہوں نے کہا "وہب بن جریر کے پاس جا رہا ہوں۔وہ سیرت کی

کچھ کتابیں اپنے باپ سے بواسطہ مجالد سناتے ہیں"۔ یحییٰ بن سعید نے فرمایا "تم بہت جھوٹ لکھ ڈالو گے"۔

○ ابو حاتم الرازی، کتاب الجرح والتعدیل، ج ۳، ص ۱۶۱، قسم اول، دائرۃ المعارف دکن ۱۳۷۲ھ و تہذیب التہذیب ایضاً، ج ۱۰، ص ۴۰، ۱۳۲۶ھ ؎

اس کے علاوہ اشج کا قول ہے کہ "یہ شیعہ ہے"۔ ○ میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۴۳۸ ؎

چوتھے راوی فضیل بن خدیج ہیں، ان کے بارے میں حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابو حاتم کا قول ہے کہ "فضیل بن خدیج اشتر کے غلام سے روایت کرتا ہے، مجہول ہے اور جو راوی اس سے روایت کرتا ہے وہ متروک ہے"۔ ○ میزان الاعتدال ج ۲ ص ۳۳۳ و لسان المیزان ج ۴ ص ۴۵۳ ؎

ان کے علاوہ دو راوی جن کا ذکر ابو مخنف نے کیا ہے، یعنی صقعب بن زہیر اور فضیل بن خدیج، وہ تو سرے سے مجہول ہی ہیں۔ (صقعب بن زہیر کو اگرچہ امام ابو زرعہ نے ثقہ قرار دیا ہے)۔ اس کے بارے میں ابو حاتم رازی فرماتے ہیں کہ

شیخ لیس بمشهور ○ الجرح والتعدیل، ج ۲، قسم ۱، ص ۴۵۵ ؎

اور فضیل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

هو مجهول روی عنه رجل متروک الحدیث ○ الجرح والتعدیل، ج ۳، قسم ۲، ص ۷۲ ؎

اب آپ غور فرمایے کہ جس روایت کے تمام راوی از اول تا آخر شیعہ ہوں اور ان میں سے بعض نے مقصد ہی یہ بنا رکھا ہو کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف بری بھلی باتیں منسوب کریں۔ کیا ایسی روایت کے ذریعے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی الزام عائد کرنا سراسر ظلم نہ ہوگا؟ مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ "میں قاضی ابوبکر بن العربی اور علامہ ابن تیمیہ کی کتابوں پر اعتماد کرنے کے بجائے خود تحقیق کر کے آزادانہ رائے قائم کرنے کا راستہ اس لیے اختیار کیا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی کتابیں شیعوں کے رد میں لکھی ہیں لہٰذا ان کی حیثیت "وکیل صفائی" کی سی ہو گئی ہے"۔

○ خلافت و ملوکیت، ص ۳۲۰ ؎

اب مودودی صاحب خود ہی انصاف فرمائیں کہ کیا یہ غیر جانبداری کا تقاضا ہے کہ "وکیل صفائی" کی بات تو سنی ہی نہ جائے۔ خواہ وہ کتنی ثقہ، قابل اعتماد اور قابل احترام شخصیت ہو اور دوسری طرف "مدعی" کی بات کو بے چوں وچرا تسلیم کر لیا جائے خواہ وہ کتنا ہی جھوٹا اور افترا پرداز ہو؟ قاضی ابوبکر بن العربیؒ اور ابن تیمیہؒ (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دشمن نہیں، صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ثقہ دوست ہیں۔ دوسری طرف ہشام بن الکلبی اور ابومخنف، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کھلے دشمن ہیں اور ان کی افترا پردازی ناقابل تردید دلائل کے ساتھ ثابت ہے۔ یہ آخر غیر جانبداری کا کون سا تقاضا ہے کہ پہلے فریق کی روایات سے صرف ان کے "حب معاویہ رضی اللہ عنہ" کی وجہ سے یکسر پرہیز کیا جائے اور دوسرے فریق کی روایات پر ان کے "بغض معاویہ رضی اللہ عنہ" کے باوجود کوئی تنقید ہی نہ کی جائے؟

مودودی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بعض حضرات تاریخی روایات کو جانچنے کے لیے اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں راویوں کو ائمہ رجال نے مجروح قرار دیا ہے۔ یہ باتیں کرتے وقت یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ محدثین نے روایات کی جانچ پڑتال کے یہ طریقے دراصل احکامی احادیث کے لیے اختیار کیے ہیں۔۔۔ الخ"۔ پھر آگے لکھتے ہیں کہ "اس لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ابن سعد، ابن عبدالبر، ابن کثیر، ابن جریر، ابن حجر اور ان جیسے دوسرے ثقہ علماء نے اپنی کتابوں میں جو حالات مجروح راویوں سے نقل کیے ہیں انہیں رد کر دیا جائے۔۔۔ الخ"۔ (خلافت وملوکیت۔ ص ۳۱۷ تا ۳۱۹)

یہاں سب سے پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاریخی روایات میں سند کی جانچ پڑتال کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور جو روایتیں ان مورخین نے اپنی کتابوں میں درج کر دی ہیں، انہیں بس آنکھ بند کر کے قبول ہی کر لینا چاہیے تو آخر ان حضرات نے تقریباً ہر روایت کے شروع میں سند کو نقل کرنے کی زحمت ہی کیوں اٹھائی؟ کیا اس طرز عمل کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روایات کے صحت وسقم کی ذمہ داری اپنے قارئین اور محققین پر ڈال رہے ہیں کہ مواد ہم نے جمع کر دیا، اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اسے تحقیق وتنقید کے کسوٹی پر پرکھو اور

اہم نتائج اخذ کرنے کے لیے صرف ان روایت پر بھروسہ کرو جو تحقیق و تنقید کے معیار پر پوری اترتی ہوں۔ ورنہ اگر تاریخی روایات کے معاملے میں "اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر نہ بیٹھ جانے" کی ممانعت کر دی جائے تو خدارا مودودی صاحب یہ بتلائیں کہ ابن جریر نے جو یہ نقل کیا ہے کہ "حضرت داؤد علیہ السلام (معاذ اللہ) اوریا کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے اس لیے اسے متعدد خطرناک جنگی مہمات پر روانہ کر کے اسے مروا دیا پھر اس کی بیوی سے شادی کر لی"۔ اسے رد کر دینے کی آخر کیا وجہ ہے؟ نیز ابن جریر نے جو اپنی تاریخ میں بے شمار متعارض احادیث نقل کی ہیں، ان میں ترجیح آخر کس بناء پر دی جا سکے گی؟

تطویل سے بچنے کے لیے ہم اس بحث کو یہاں چھوڑتے ہیں کہ حدیث اور تاریخ کے درمیان معیار صحت کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟ ہم چونکہ یہاں خاص اس روایت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جس سے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کیا کرتے تھے، اس لیے مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ روایت کیوں ناقابل قبول ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ اور حدیث کے فرق کو ملحوظ رکھنے کے باوجود مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر مودودی صاحب کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ روایت قطعی طور پر ناقابل اعتماد ہے۔

۱۔ اس کے راوی سارے کے سارے شیعہ ہیں اور کسی روایت سے جو صرف شیعوں سے منقول ہو، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

۲۔ اس کے تمام راوی ضعیف یا مجہول ہیں اور ایسی روایت تاریخ کے عام واقعات کے معاملے میں تو کسی درجہ میں شاید قابل قبول ہو سکتی ہو، لیکن اس کے ذریعے کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہو سکتی جس سے کسی صحابی رضی اللہ عنہم کی ذات مجروح ہوتی ہو۔

۳۔ یہ روایت، درایت کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی، اس لیے کہ اگر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے سات سال سے زائد مدت تک منبروں پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ

پر "سب وشتم کی بوچھاڑ" کرتے رہے تو

الف۔ اس "سب وشتم" کی روایت کرنے والے تو بے شمار ہونے چاہئیں، یہ صرف ایک شخص ہی اس کی روایت کیوں کر رہا ہے؟ اور ایک بھی وہ جو شیعہ ہے اور اس کا جھوٹا ہونا معروف ہے؟

ب۔ کیا پوری ملت اسلامیہ اپنے "خیر القرون" میں ایسے اہل جرأت اور انصاف سے قطعی طور پر خالی ہو گئی تھی جو اس "مکروہ بدعت" سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے گورنروں کو روکتے، کیا حضرت حجر بن عدی کے علاوہ کوئی باغیرت مسلمان کوفہ میں موجود نہیں تھا؟

ج۔ عدالت و دیانت کا معاملہ تو بہت بلند ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عقل و تدبر اور سیاسی بصیرت سے تو ان کے دشمنوں کو بھی انکار نہیں ہوگا۔ کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان جیسا صاحب فراست انسان محض بغض کے جذبات میں بہہ کر ایک ایسا بے فائدہ اقدام کرے جو اس کی حکومت کے استحکام کے لیے خطرہ بن سکتا ہے؟ کوفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معتقدین کا مرکز تھا، کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر "سب وشتم" کروا کر یہ چاہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بھی اہل کوفہ سے برابر لڑائی ٹھنی رہی اور وہ کبھی دل سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ ہوں؟ کوئی گھٹیا سے گھٹیا سیاست دان بھی کبھی یہ نہیں کر سکتا کہ اپنے مخالف قائد کے مرنے کے بعد اس قائد کے معتقدین کے گڑھ میں بلاوجہ اسے گالیاں دیا کرے۔ ایسا کام وہی شخص کر سکتا ہے جسے لوگوں کو خواہ مخواہ اپنی حکومت کے خلاف بھڑکانے کا شوق ہو۔ (مودودی صاحب تو اس قسم کے درایتی قرائن کی بناء پر بالکل صحیح الاسناد احادیث کو بھی رد کر دینے کے قائل ہیں، چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں صحیح بخاری کی ایک حدیث کو صحیح الاسناد ماننے کے باوجود مودودی صاحب نے اس لیے رد کر دیا ہے کہ وہ درایت کے اس جیسے قرائن کے خلاف ہے۔ حالانکہ وہ حدیث بھی کوئی "احکامی حدیث" نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی واقعہ ہی ہے۔ کیا اس موقع پر وہ درایت کے ان قرائن کی بناء پر ایک سراسر ضعیف روایت کو رد نہیں کریں گے؟)

ان وجوہ کی بناء پر یہ روایت تو قطعی طور پر ناقابل قبول ہے۔ دوسری روایت جس کا حوالہ مودودی

صاحب نے دیا ہے البدایہ والنہایہ کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

ولما كان (مروان) متوليا على المدينة لمعاوية رضي الله عنه كان يسب عليا رضي الله عنه كل جمعة على المنبر وقال له الحسن بن علي رضي الله عنهما لقد لعن الله أباك الحكم وأنت في صلبه على لسان نبيه فقال له لعن الله الحكم وما ولد والله أعلم

"جب مروان مدینہ منورہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا گورنر تھا، اس وقت وہ ہر جمعہ کو منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہم پر سب وشتم کیا کرتا تھا اور اس سے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا تیرے باپ حکم پر اللہ نے اپنے نبی ﷺ کی زبان سے اس وقت لعنت کی تھی جب تو اس کی صلب میں تھا اور یہ کہا تھا کہ حکم اور اس کی اولاد پر خدا کی لعنت ہو"۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۲۵۹)

اگرچہ یہ روایت کئی وجہ سے مشکوک ہے۔ (اول تو اس لیے کہ یہ پوری عبارت البدایہ والنہایہ کے اصل مصری نسخے میں موجود نہیں ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اس کے آخر میں آنحضرت ﷺ کی طرف جو الفاظ منسوب کیے گئے ہیں وہ بہت مشکوک ہیں) لیکن اتنی بات کچھ اور روایتوں سے بھی مجموعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مروان بن الحکم مدینہ منورہ کی گورنری کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کیا کرتا تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو محبوب رکھنے والوں کو ناگوار گزرتے تھے۔ لیکن یہ نازیبا الفاظ کیا تھے؟ ان تاریخی روایتوں میں سے کسی میں ان کا ذکر نہیں البتہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ایک واقعہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ۔

أن رجلا جاء إلى سهل رضي الله عنه بن سعد فقال هذا فلان لأمير المدينة يدعو عليا رضي الله عنه عند المنبر قال فيقول ماذا قال يقول له أبو تراب فضحك وقال والله ما سماه إلا النبي ﷺ وما كان له اسم أحب إليه منه

"ایک شخص حضرت سہل رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور بولا کہ امیر مدینہ منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو

ہوئے حوالے کے اندر یا اور کہیں یہ بات موجود نہیں ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کیا کرتا تھا۔

۴۔ سب وشتم کی بوچھاڑ کا لفظ بھی بلا دلیل ہے، اس لیے کہ مودودی صاحب کے دیے ہوئے حوالے میں تو سب وشتم کے الفاظ منقول نہیں۔ صحیح بخاری کی روایت سے جو الفاظ معلوم ہوتے ہیں انہیں سب وشتم، کھینچ تان کر ہی کہا جا سکتا ہے۔

۵۔ دوسرے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مودودی صاحب نے حوالہ صحیح دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس میں یہ تصریح ہے کہ وہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے بددعا کیا کرتے تھے۔ دوسرے یہ روایت از اول تا آخر سارے کے سارے شیعہ راویوں سے مروی ہے اور روایت و درایت ہر اعتبار سے واجب الرد ہے۔